رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

عدد ۳

ماہنامہ

میثاق

لاہور

•

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

•

دفترِ رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور

جلد ۹ [illegible]

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱ ‖ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۹ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۹ھ ‖ عدد ۵

تذکرہ و تبصرہ ———— امین احسن اصلاحی ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ———— امین احسن اصلاحی ۱۷

اسلامی قانون

اسلامی قانون کے ماخذ ———— امین احسن اصلاحی ۳۱

سفر حج

منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں ———— امین احسن اصلاحی ۳۹

ہندوستانی خریداروں کیلئے ارسالِ زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

محمد الدین پرنٹر و پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۰۔ ... سٹریٹ ۱۔ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کے پچھلے شمارے میں آپ نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ دیکھ لیا کہ کسی ایک محدث نے بھی یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ راویان حدیث پر جرح کرنا غیبت ہے بلکہ جس کے سامنے بھی اس کے غیبت ہونے کا ذکر آیا ہے اس نے پوری شدت کے ساتھ اس مہمل خیال کی تردید کی ہے۔ اب ہم اس سوال پر غور کریں گے کہ محدثین نے جرح و تعدیل کے کام کو قرآن اور حدیث کے نصوص پر مبنی کیا ہے یا نہیں؟ اور اگر کیا ہے تو کن نصوص پر کیا ہے تاکہ اس خیال کی غلطی بھی واضح ہو جائے کہ محدثین میں سے کسی نے یہ دلیل پیش نہیں کی ہے کہ ہمارے اس کام (جرح و تعدیل کے کام) کا حکم فلاں آیت یا فلاں حدیث میں دیا گیا ہے؟

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ مسلم شریف کے مقدمہ میں اپنی کتاب کی تالیف کا یہ مقصد واضح کرنے کے بعد کہ اس میں صرف صحیح روایات کا جمع کرنا مقصود ہے اور ان جھوٹی اور کمزور روایات سے اس کو پاک رکھنا ہے جن کی اشاعت اس زمانہ میں عام ہو رہی ہے، اپنے اس نصب العین کی شرعی بنیاد واضح کرنے کے لیے ایک باب باندھتے ہیں جس کے الفاظ ہیں: باب وجوب الروایۃ عن الثقات وترک الکذابین (باب اس بارے میں کہ واجب ہے کہ روایت صرف ثقہ لوگوں سے کی جائے اور جھوٹوں کو چھوڑ دیا جائے) اس عنوان باب کے تحت وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ فرماتے ہیں:

ان الواجب علی کل احد عرف التمییز	جس شخص نے صحیح اور سقیم روایات اور ثقہ اور متہم

بین صحیح الروایات وسقیمہا و	راویوں میں امتیاز کرنا معلوم کر لیا ہے اس پر
ثقات الناقلین لہا من المتہمین	واجب ہے کہ وہ صرف انہی حدیثوں کی روایت
ان لا یروی منہا الا ما عرف صحۃ	کرے جن کے طریقوں کی صحت اور جن کے
مخارجہ والستارۃ فی ناقلیہ وان	راویوں کی ثقاہت اس پر ثابت ہو چکی ہے۔
یتقی منہا ما کان عن اہل التہم	اور ان حدیثوں کے نقل و روایت سے بچے
والمعاندین من اہل البدع والدلیل	جن کا واسطہ متہم اشخاص اور معاند اہل بدعت
علی ان الذی قلنا من ہذا ہو اللازم	ہوں۔ دلیل اس بات پر کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے
دون ما خالفہ قول اللہ تعالیٰ	یہی لازم ہے اور جس کے خلاف روش غلط ہے
یا ایہا الذین اٰمنوا ان جاءکم	اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے یا ایہا الذین اٰمنوا
فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوماً	ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان
بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم	تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علی
نادمین ۵ وقال جل ثناءہ ممن	ما فعلتم نادمین[۱]۔ نیز فرمایا ہے ممن
ترضون من الشہداء وقال	ترضون من الشہداء[۲] نیز ارشاد ہے
واشہدوا ذوی عدل منکم	واشہدوا ذوی عدل منکم[۳] ہم نے
فدل بما ذکرنا من ہذہ الآی ان	جن آیتوں کا حوالہ دیا ہے یہ اس بات پر دلیل
خبر الفاسق ساقط غیر مقبول وان	ہیں کہ فاسق کی خبر ناقابل اعتبار اور غیر مقبول ہے
شہادۃ غیر العدل مردودۃ۔ والخبر	اور غیر ثقہ کی شہادت ناقابل التفات ہے۔
وان فارق معناہ معنی الشہادۃ	خبر اگرچہ بعض پہلوؤں سے شہادت سے ایک
فی بعض الوجوہ فقد یجتمعان فی	مختلف چیز ہے لیکن اپنے بڑے مقاصد میں
اعظم معانیہما اذ کان خبر الفاسق	یہ دونوں مشترک بھی ہیں، کیونکہ جس طرح فاسق کی

---

[۱] ۶ - حجرات: اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اچھی طرح تحقیق کرو، مبادا کہ تم غصہ میں کسی قوم پر جا پڑو، پھر تمہیں اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔

[۲] ۲۸۳ - بقرہ: ان میں سے گواہ بناؤ جن پر تم اعتماد کرتے ہو۔

[۳] ۲ - طلاق: اور گواہ بناؤ اپنے اندر سے دو عادل آدمیوں کو۔

غیر مقبول عند اهل العلم كما ان شهادته مردودة عند جميعهم ودلت السنة على نفي رواية المنكر من الاخبار كنحو دلالة القرآن على نفي خبر الفاسق وهو الاثر المشهور عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهو احد الكاذبين (مقدمہ مسلم)

خبر اہل علم کے نزدیک غیر مقبول ہے اسی طرح اس کی شہادت بھی سب کے نزدیک قابل رد ہے۔ جس طرح قرآن نے خبر فاسق قبول کرنے سے روکا ہے اسی طرح سنت نے بھی منکر روایات کی نفی کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور اثر مروی ہے کہ جس نے میری طرف سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کی نسبت اس کا گمان ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

اس کے بعد امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ایک مستقل باب کے تحت وہ روایات لائے ہیں جن میں ہر قسم کے جھوٹے سچے راویوں کے واسطے سے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں بغیر کسی تحقیق کے نقل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس طرح کی حرکت کرنے والوں کو اُس جھوٹ کے پھیلانے میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے جو اصل راوی کی جھوٹی روایت سے وجود میں آیا ہے۔ اس باب کی دو روایتیں خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں:۔

عن حفص بن عاصم قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع

حفص بن عاصم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سن پائے اس کی روایت کر ڈالے۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:۔

بحسب المرء من الكذب ان يحدث بكل ما سمع

آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ جھوٹ کافی ہے کہ جو کچھ سن پائے اس کی روایت کرنے لگ جائے۔

•

اس کے بعد امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ایک باب اس عنوان سے باندھتے ہیں۔ باب النهي عن الرواية عن الضعفاء والكذابين ومن يرغب عن حديثهم[1]۔ اس باب کی بھی چند حدیثیں سن لیجیے:۔

عن ابي هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال سيكون في آخر امتي اناس يحدثونكم ما لم تسمعوا انتم ولا آباءكم فاياكم واياهم

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے دور آخر میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو تمہیں ایسی حدیثیں سنائیں گے جو نہ تم نے سُنی ہوں گی اور نہ تمہارے باپ دادانے تو ان سے بچ کے رہنا

انہی حضرت ابوہریرہؓ سے دوسری روایت ہے:۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يكون في آخر الزمان دجالون كذابون ياتونكم من الاحاديث بما لم تسمعوا انتم ولا آباءكم فاياكم واياهم لا يضلونكم ولا يفتنونكم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایسے فریبیے اور لپاٹیے پیدا ہوں گے جو تمہیں ایسی حدیثیں سنائیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے اگلوں نے تو تم ان سے بچ کے رہنا، وہ تمہیں گمراہ کرنے اور فتنے میں ڈالنے نہ پائیں۔

اسی سلسلہ میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباسؓ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک راوی کے منہ پر یہ برملا ظاہر کر دیا کہ ہم ہر قسم کے لوگوں سے ہر قسم کی روایتیں نہیں لیا کرتے، واقعہ سنیے:۔

"مجاہد روایت کرتے ہیں کہ بشیر عدوی ابن عباسؓ کے پاس آئے اور ایک حدیث بیان کرنے لگے۔ وہ بار بار کہتے رسول اللہ نے فرمایا، رسول اللہ نے فرمایا، لیکن حضرت ابن عباسؓ نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا۔ بالآخر بشیر عدوی بولے، اے ابن عباس! کیا بات ہے کہ آپ میری حدیث نہیں سن رہے ہیں، میں آپ کو رسول اللہ کی حدیث سُنا رہا ہوں لیکن آپ التفات نہیں فرما رہے ہیں؟ ابن عباسؓ نے فرمایا، ایک زمانہ تھا جب ہمارا یہ حال تھا کہ جہاں کسی کی زبان سے نکلا کہ رسول اللہ نے فرمایا تو فوراً اس کی طرف ہمارے آنکھ اور کان متوجہ ہو جاتے تھے لیکن جب ہم نے

[1] یہ باب اس امر کے بیان میں ہے کہ جو لوگ ضعیف الروایت ہیں یا جھوٹے ہیں یا نا قابلِ اعتماد ہیں ان سے حدیث کی روایت ممنوع ہے۔

مسلمانوں کی خصوصیات میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ ان لوگوں کے اندر تقویٰ اور خشیت کی صفت پہلے سے موجود تھی اس وجہ سے ان کو قرآن سے نفع پہنچا۔ ان کے اندر امی عربوں میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کے اندر زمانہ کے عام فساد کے باوجود بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور ان کو فطرت کی ہدایت کی جو روشنی ملی تھی اس کو انھوں نے اپنے اندر محفوظ رکھا تھا۔ اسی طرح ان کے اندر اہل کتاب میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، وہ بھی اپنی اپنی شریعتوں پر اپنے علم کی حد تک نیک نیتی سے عمل کرنے والے تھے اس وجہ سے یہ لوگ مستحق ٹھہرے کہ اللہ تعالےٰ ان کو اپنی آخری اور کامل ہدایت سے بہرہ ور کرے۔

اس تصویر میں مسلمانوں کے جو خدوخال نمایاں کیے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے ایک طرف اگر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان کے اصلی اوصاف کیا ہیں یا کیا ہونے چاہئیں تو دوسری طرف یہی تصویر ان لوگوں کو بھی سامنے لا کھڑا کرتی ہے جو اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ساتھ ہی نہایت خوبی کے ساتھ، اشارات و کنایات کے پردہ میں، ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کی طرف بھی اشارے کردیتی ہے۔ اشارات وکنایات کے اس پردہ کو اٹھائیے تو اس کے نیچے سے یہود برآمد ہوتے ہیں، جن سے اس سورہ میں جیسا کہ ہم واضح کرچکے ہیں، اصل بحث ہے۔ اپنی جن اخلاقی و روحانی بیماریوں کے سبب سے یہود قرآن کی نعمت سے محروم ہوئے ان کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن نے یہ بلیغ انداز اختیار کیا کہ مسلمانوں کی ان عملی واعتقادی خصوصیات کو خاص طور پر نمایاں کیا جن کے بالکل ضد خصوصیات یہود نے اپنے اندر جمع کر رکھی تھیں۔ اور جو قبول حق میں ان کے لیے ایسی رکاوٹ بن گئی تھیں کہ اس پر قابو پانا ان کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔

ہم قرآن کے ان لطیف اشارات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کیا تھے۔

سب سے پہلے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ بات کہ یہ کتاب متقین ہی کے لیے ہدایت ہے یہود کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک اہم فیصلہ کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے توبہ کرائی اور ان کو تطہیر و تزکیہ کی بعض سخت آزمائشوں سے گذارا تو اس وقت ان کے لیے انھوں نے یہ دعا بھی فرمائی کہ آئندہ یہ خدا کے غضب سے محفوظ

رہیں اور اس کی رحمت سے کبھی محروم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول تو فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آئندہ اس کی جو رحمت، آخری شریعت کی شکل میں، نازل ہونے والی ہے اس سے یہود میں سے صرف وہی لوگ بہرہ یاب ہوسکیں گے جو خدا سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں گی ان پر ایمان لائیں گے۔ سورہ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ دعوت کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے مندرجہ ذیل آیت بھی آتی ہے۔ اس آیت پر اس کے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ۔ الآیہ (۱۵۶-۱۵۷ اعراف)

اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے، پس میں اس کو لکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو رسول، نبی امی کی پیروی کریں گے۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی نعمت حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے صرف انہی لوگوں کو ملنے والی تھی جو تقویٰ پر قائم رہنے والے، زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے تھے۔ پھر آیت کے آخر میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ تھے جو نبی اُمی کی پیروی کریں۔ بعینہٖ اسی شرط کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے الفاظ یہاں یاد دلا رہے ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اس شرط پر پورے اُترے وہ ایمان لائے اور اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے وہ تقویٰ اور خشیت کی اس صفت سے عاری تھے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔

ٹھیک اسی طرح کی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی فرمائی تھی۔ ان کو مختلف امتحانوں میں جانچنے کے بعد جب قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۱۲۴ - بقرہ) (میرا یہ عہد تمھاری ذریت میں سے ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ وخشیت سے خالی ہوں، خواہ ان کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہو یا حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات

واضح فرمادی تھی کہ جب یہ پیغمبر اور جس پیغمبر کی امت کو دنیا کی امامت ملنے والی ہے ظالم لوگ نہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں گے اور نہ اس عزت میں حصہ دار ہوں گے جو اس کو اور اس کی امت کو ملنے والی ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ یہود کی اس محسوسات پرستی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں وہ ابتدا سے مبتلا رہے ہیں۔ اپنی اسی بیماری کے سبب سے یہود عین اپنے نبی کی موجودگی میں ایک بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ مصر کے دور غلامی میں وہ جس ذہنی و روحانی پستی میں مبتلا ہو گئے تھے اس سے آخر وقت تک ان کو نکلنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ان کا اصرار یہی رہا کہ وہ ایک مرتبہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ لیں تب وہ اس بات کو مانیں گے کہ فی الواقع وہ حضرت موسیٰؑ سے کلام بھی کرتا ہے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمہاری بات اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک ہم خود بھی خدا کو کھلم کھلا دیکھ لیں ۵۵۔ بقرہ) اسی طرح کی بات مشرکین مکہ بھی کہتے تھے۔ ان کا اعتراض بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ اگر اللہ آپ سے کلام کرتا ہے تو آخر ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ قرآن نے یہ کہہ کر کہ اس کتاب پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو غیب میں رہتے ایمان لائیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ خدا کو چھو کر اور ٹٹول کر اور تمام حقائق کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ایمان لانا چاہتے ہیں ان کے لیے قرآن میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن کا فیض صرف ان معقول لوگوں کو پہنچے گا جو حواس ظاہری سے زیادہ عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ایمان لانے والوں کی یہ تعریف کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہودؑ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی اس حالت پر تعریض ہے جس کا ذکر قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹ مریم) (پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوتوں کے پیچھے پڑ گئے تو جلد وہ اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے)

اہل ایمان کے انفاق کے ذکر میں یہود اور ان کے حبقہ کے دوسرے ساتھیوں کی اس بخالت اور اس زر پرستی پر تعریض ہے جو ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ قرآن کے زمانہ نزول میں ان کے عوام تو در کنار ان کے

لہ سورہ بقرہ کی آیت ۸۳ میں نہایت واضح الفاظ میں یہود کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے کا جو عہد لیا گیا تھا وہ عہد انھوں نے توڑ ڈالا

علماء اور صوفیاء کا جو حال تھا اس کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴۔ توبہ)

اے ایمان والو، بہت سے فقیہ اور صوفی لوگوں کے مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے ہیں اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر رہے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ الآیۃ میں یہود کے اس گروہی تعصب پر تعریض ہے جو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہود کو جب دعوت دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آخری کتاب۔ قرآن پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ جو کتاب ہم پر اتری ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھنا ہمارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد ہم کسی اور کتاب اور قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاۗءَهٗ (۹۱۔ بقرہ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی یہ تعریف کہ "آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں" آخرت کے بارہ میں یہود کی اس بے یقینی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی شہادت اُن کی عملی زندگی کے ہر گوشے سے مل رہی تھی۔ یوں تو وہ آخرت پر نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ آخرت کی ساری کامیابیاں تنہا انہی کا حصہ ہیں لیکن دوسری طرف زندگی اور اسباب زندگی کی محبت میں اس قدر غرق تھے کہ ان مشرکین کو بھی مات کر گئے تھے جو آخرت کا تصور یا تو سرے سے رکھتے ہی نہیں تھے یا رکھتے تھے تو نہایت مبہم اور دھندلا۔ مشرکین ہی کی طرح انھوں نے بھی غلط قسم کی شفاعت کا تصور قائم کر لیا تھا اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ ظاہر ہے کہ آخرت پر اس طرح کا ایمان ایک بالکل بے معنی ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس ایمان

کی تعلی اس طرح کھولی ہے :۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ، وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۹۴ - بقرہ)

کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابی دوسروں کے مقابل میں خاص کر تمہارا ہی حصہ ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اور وہ اپنی کرتوتوں کے سبب سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے ۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ، تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے ان سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں ۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ متقین کے ذکر کے بعد ان متقین کی جو تصویر قرآن نے پیش کی ہے اس سے ایک طرف تو وقت کے اہل ایمان سامنے آگئے اور یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ تھے جن کے اندر تقویٰ اور خشیت کی فطری صلاحیتیں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی ۔ دوسری طرف اسی تصویر نے یہود اور ان کے حلیفوں کو سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف اور اس خوف کی تمام برکتوں سے خالی ہیں، اس وجہ سے یہ قرآن کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے ۔

ان چند الفاظ کے اندر اتنی لمبی تفصیل کو چھپا دینا اور یہود کا نام لیے بغیر ان کو اس طرح بے نقاب کر دینا قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے ۔

۷ ۔ چند سوالات اور ان کے جواب

ان آیات پر جو شخص بھی تدبر کی نگاہ ڈالے گا اس کے ذہن میں چند سوالات ضرور پیدا ہوں گے ۔

ایک یہ کہ یہاں قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویٰ محض ایک دعوے کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے ۔ حالانکہ جب یہی بات اس سورہ کا عمود ہے تو اس کو صرف ایک دعوے کی شکل میں رکھ دینا کافی نہیں تھا ۔ بلکہ نہایت مضبوط دلائل سے اس کو ثابت کرنا تھا ۔

دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے ۔ اگر یہ کتاب متقیوں ہی کے لیے ہدایت ہے تو پھر اس کے اترنے کا فائدہ کیا ہوا ؟ ضرورت تو تھی کہ اس کی

برکت سے جو بدکار تھے وہ پرہیزگار اور جو گنہگار تھے وہ نیکوکار بنتے لیکن جب بیماروں کو شفا دینے کے بجائے یہ تندرستوں ہی کو تندرست بنانے آئی ہے تو اس کا نازل ہونا تو تحصیل حاصل ہی رہا ۔

تیسرا یہ کہ متقین کی پہلی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں ۔ ایمان بالغیب کے متعلق عام خیال تو یہ ہے کہ یہ محض عامیانہ تقلید یا وہمی پن یا خوش عقیدگی سے پیدا ہوتا ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن اپنی تاثیر کا جوہر صرف انہی پر دکھا سکتا ہے جو وہمی اور خوش عقیدہ قسم کے لوگ ہوں ، سوچنے سمجھنے اور غور و فکر سے کام لینے والوں پر اس کا بیان یا استدلال کارگر نہیں ہو سکتا ۔

چوتھا یہ کہ یہاں متقین کی چند صفات بھی گنائی گئی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہ سارے کام کر رہے ہیں تو اس کے بعد وہ کون سی ہدایت ہے جس کے یہ محتاج رہ جاتے ہیں اور جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے ؟ کیا ہدایت ان چیزوں سے بالاتر کسی چیز کا نام ہے جس کا ان سارے کاموں کے کرنے کے بعد بھی آدمی محتاج رہ جاتا ہے ؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ یہاں ایمان کے بعد عملی نیکیوں میں سے صرف دو ہی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک نماز کا ، دوسری انفاق کا ۔ آخر ان کی اہمیت کا وہ کیا خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری کسی نیکی کا ذکر نہیں کیا گیا ؟

سوالات تو بعض اور بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا جواب تھوڑے سے غور و فکر سے ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں ۔ البتہ مذکورہ سوالات خاص اہمیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ہم ترتیب کے ساتھ ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے ۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخالفین اگر قرآن کا انکار کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ قرآن کا کتاب اللہ ہونا ان پر واضح نہیں تھا ۔ کم از کم سورۂ بقرہ کے زمانہ نزول (یعنی) اوائل ہجرت میں تو اس کتاب کا کتاب الٰہی ہونا اہل کتاب اور مشرکین سب پر واضح ہو چکا تھا ۔ قبول حق میں جو چیز مانع تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حق اچھی طرح واضح نہیں تھا بلکہ یہ تھی کہ قبول حق کے لیے طبیعتوں میں جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں تھی ۔ ایسی صورت میں ثابت کرنے کی

بات یہ نہیں تھی کہ یہ کتاب الٰہی ہے اور اس کے کتاب الٰہی ہونے کی یہ یہ دلیلیں ہیں بلکہ کہنے کی بات یہی تھی کہ یہ کتاب الٰہی ہے ۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے طبیعتوں میں صلاحیت کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا ہے ۔ یہاں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کہہ کر اس نے اس شرط کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے ۔ یہ شرط ہے تقویٰ اور خدا ترسی ۔ گویا قرآن یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہا ہے کہ نہ قرآن کا کتاب الٰہی ہونا محتاج ثبوت ہے اور نہ تمہارا فرستادۂ الٰہی ہونا ۔ یہ بالکل واضح حقیقتیں ہیں لیکن ان حقیقتوں کی وضاحت ان لوگوں کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہیں جن کی آنکھوں پر محسوسات کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں جو فطرت کی بنیادی نیکیوں کو بھی ختم کر چکے ہیں اور جن کو تعصب نے بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہے ۔

علاوہ بریں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس سورہ میں اصلی خطاب جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ، یہود سے ہے ۔ یہود آخری کتاب اور آخری رسول سے ناآشنا نہیں تھے ۔ تورات کی کتاب تثنیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کے بھائیوں کے اندر سے ان کے لیے ایک نبی بھیجے گا ، اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا ، اس کے ذریعہ سے شریعت کو کامل کرے گا ، اس کے واسطہ سے ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا ، جو اس کی بات نہ سنیں گے وہ ان کو سزا دے گا ۔ وہ خدا کے نام سے کلام کرے گا ، اس کی پیشین گوئیاں سچی ہوں گی اور وہ اس وقت تک دنیا میں رہے گا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو جائے ۔

یہود ان ساری باتوں سے اچھی طرح باخبر بھی تھے اور ان میں سے ایک ایک بات کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی زندگی کے حالات نے ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا ۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد تو وہ تمام آثار بالکل سامنے آ چکے تھے جن کو دیکھ لینے کے بعد یہود کو یقین ہو چکا تھا کہ تورات کی اس پیشین گوئی کے مصداق درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ۔ پھر یہود اس پیشین گوئی ہی کی بنا پر ایک نبی اور کتاب کے منتظر بھی تھے ۔ ایسے حالات کے اندر ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ گویا انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ وہی موعود کتاب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا جس کے تم منتظر رہے ہو اور جو ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس کے

بارے میں تمہیں پہلے بتائی جا چکی ہیں ۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس دعوے پر دلیل کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہود اپنے تعصب ، اپنی ضد ، اور اپنے حسد سے باز آئیں اور اس کتاب کو جس کے لیے وہ مدت ہائے دراز سے چشم براہ تھے ہاتھوں ہاتھ لیں اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا تجربہ کریں ۔

دوسرے سوال کا جواب اگرچہ پہلے سوال کے جواب کے ذیل میں ایک حد تک آ چکا ہے لیکن ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ اس کے وہ پہلو بھی سامنے آ جائیں جو نہیں آ سکے ہیں ۔

انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود موثر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو ۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اندھا ہو تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے لیکن اگر ایک شخص بہرا ہے تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح قرآن کا نور ہونا ، بصیرت ہونا ، سرچشمہ ہدایت ہونا مسلّم لیکن اگر ایک شخص نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کر دی ہے جو اس نور اور اس سرچشمہ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا ۔ قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ (اس میں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے ۔ (۲۶ نازعات) إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (بے شک اس کے اندر یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنے (۳۷ ۔ ق)

یہ انسان کی اسی فطری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے ۔ اسی چیز کو یہاں تقویٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے ۔

اس تقویٰ کے کئی درجے ہیں ۔ ایک تو وہ تقویٰ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے جس کی طرف قرآن نے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے ۔ یہ تقویٰ نیکی کی ہر بات اور بھلائی کی ہر دعوت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے ۔ جس نے اپنے اندر سے یہ تقویٰ ضائع کر دیا گویا وہ اس معقولیت ہی سے خالی ہو بیٹھا جو اس کو نیکی اور بھلائی کی طرف راغب کر سکتی تھی ۔ یہ تقویٰ جس طرح انسانیت اور شرافت کے سارے ہی کاموں پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح [illegible] کی

دعوت کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قرآن چیز ہی ایسی ہے کہ اس کی طرف بے ذوق اور اوباش قسم کے لوگ متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہی لوگ متوجہ ہو سکتے تھے جن کے اندر نیکی اور شرافت کا جوہر موجود ہو۔ چنانچہ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ قرآن کی دعوت نے عربوں میں سے ان لوگوں کو اپیل کیا جو سنجیدہ اور معقول تھے اور اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جذب کیا جو متقی اور خدا ترس تھے۔

دوسرا تقویٰ وہ ہے جو قرآن کی پیروی کے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بھی کئی درجے ہیں۔ لیکن یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ھدی للمتقین میں تو اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد الذین یؤمنون بالغیب سے لے کر وبالآخرۃ ھم یوقنون تک ان متقین کی جو صفتیں بیان ہوئی ہیں وہ اس تقویٰ کا نتیجہ ہیں جو قرآن کی پیروی سے پیدا ہوا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان بالغیب ضعیف الاعتقادی یا وہمی پن کا ثبوت نہیں فراہم کر رہا ہے بلکہ انسان کے عقل اور روحانی ہستی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے اور قرآن نے اسی پہلو سے اس چیز کا یہاں ذکر کیا بھی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی تمام تگ و دو بس محسوسات ہی تک محدود ہوتی ہے، اس سے آگے کے لیے نہ ان کے اندر کوئی رغبت ہی ہوتی اور نہ وہ اس سے آگے جانے کی کوئی کوشش ہی کرتے۔ وہ اپنی عقل کو بھی، جو بلند پروازی کی فطری صلاحیتیں رکھتی ہے، اور جس کا اصلی میدان محسوسات نہیں بلکہ ماورائے محسوسات ہے انہی محسوسات کے اندر قید کر چھوڑتے ہیں کہ اس کو جتنا زور لگانا ہو انہی کے اندر لگائے، اس سے باہر نکلنے کو وہ بالکل بادپیمائی اور ہرزہ سرائی خیال کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہوتے جن کے نزدیک حقیقی قدر و قیمت محسوسات و مادیات کی نہیں بلکہ عقل اور اس کے ادراکات کی ہے۔ وہ عقل ہی کو انسانیت کا خاصہ اور اس کا جوہر سمجھتے ہیں، اسی چیز کو وہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کرنے والی مانتے ہیں اور ان کے دل کی حقیقی خوشی محسوسات کی فانی لذتوں میں نہیں بلکہ عقل کی ان روحانی فتوحات ہی میں ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی گروہ کی طرف یہاں یؤمنون بالغیب کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہی گروہ ہے جو اس کی بلندیوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پہلے گروہ کو تو اس نے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے بلکہ ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار

دیا ہے۔ فرمایا ہے أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ تو بالکل چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے (۴۴ فرقان) یعنی جب وہ اپنی عقل جیسی اعلیٰ چیز کو بھی محسوسات ہی کی چاکری میں لگائے ہوئے ہیں تو نہ ان کا سننا سننا ہے اور نہ ان کا سمجھنا سمجھنا۔ یہ تو وہ بے وقوف لوگ ہیں جو ایک تیغ جوہر دار سے وہ کام لے رہے ہیں جو گھاس کاٹنے کی درانتی سے لیا جاتا ہے۔

پس غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض محسوسات کے غلام اور مادیات کے پرستار نہیں ہیں بلکہ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتے ہیں اور جو باتیں عقل سے ثابت ہیں یا فطرت جن کی شہادت دیتی ہے ان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی حسی محسوس اور مادی راحتوں اور لذتوں کو قربان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان کو بے دریغ قربان کر دیتے ہیں۔

چوتھے سوال کا جواب اگرچہ دوسرے سوال کے جواب کے ضمن میں ایک حد تک آگیا ہے لیکن ہم اس کو بھی مزید واضح کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ متقین کے بعد متقین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کی حیثیت توضیحی صفات کی ہے۔ یعنی اس لفظ کے جو مصداق اس زمانہ میں قرآن کے سامنے تھے قرآن نے بطور مثال ان کی طرف انگلی اٹھا دی ہے کہ یہ لوگ ہیں جن کے اندر تقویٰ موجود تھا، چنانچہ دیکھ لو، انھوں نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ ان صفات کو آپ اس معنی میں نہ لیں کہ یہ سب قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ابتدائی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ان کی حیثیت قرآن کی پیروی کے ثمرات و برکات کی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو قرآن نے ھُدًی کہا ہے جس کی وضاحت ہم تفصیل سے اس کے مقام میں کر چکے ہیں، وہ بہرحال ظاہری اعمال و عقاید سے ایک بالاتر حقیقت ہے۔ اعمال و عقاید یا تو اس ہدیٰ کے ثمرات و برکات ہیں یا اس کے حصول کے اسباب و ذرائع، وہ بعینہٖ ہدیٰ نہیں ہیں۔ اعمال و عقاید میں آدمی کا اہتمام و انہماک جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی اس کے لیے ھدی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے)

آخری سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ قرآن کے تدبر سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی علوم کے زوال وانحطاط کے سبب سے ایسے لوگوں کا پیدا ہونا کم ہوگیا جو اجتہاد کی اہلیت رکھنے والے ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب منصب اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں کی پیداوار ہی کم ہوجائے تو اس کام کو جاری رکھنے اور مسلمانوں پر اپنی شان اجتہاد کا سکہ بٹھانے والے کہاں سے آتے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ذہن کا تعلق ہے، حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی وہ اجتہاد کے قبول کرنے کے لیے بند نہیں ہوا۔ جب بھی مسلمانوں میں کوئی شان اجتہاد کا حامل اٹھا مسلمانوں نے اس کو دلوں میں جگہ دی اور آنکھوں پر بٹھایا۔ اجتہاد کے بند ہونے کی تاریخ بغداد کی بربادی کی تاریخ سے ملائی جاتی ہے لیکن امام ابن تیمیہؒ اس کے بعد مسلمان حکومتوں کی نہایت شدید افراتفری کے دور میں اٹھے اور انھوں نے ایک عالم سے اپنے اجتہاد کا لوہا منوالیا۔ مگر ابن تیمیہؒ ایک عبقری تھے۔ عبقری روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اصل چیز یہ تھی کہ وقت کے نظام کے اندر وہ صلاحیت باقی ہوتی جس سے بلند پایہ اشخاص پیدا ہوسکتے۔ مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وقت کا نظام اس صلاحیت سے محروم ہوچکا تھا اس وجہ سے صف اول کے اشخاص بہت کم پیدا ہوئے اور درجہ دوم و سوم کے لوگوں کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ وہ اجتہاد کرکے مسلمانوں پر اپنے اجتہاد کا اعتماد قائم کرسکتے۔

اس کا دوسرا سبب مسلمانوں کا اخلاقی زوال ہے۔ اس اخلاقی زوال کے سبب سے بہت سے ذہین و فطین لوگ وقت کے حکمرانوں کے درباروں سے وابستہ ہوگئے اور انھوں نے ان کی خوشنودی و مقصد براری کے لیے اجتہادات فرمائے اور فتوے لکھے۔ اگر ان کے اندر ذہانت اور علم کے ساتھ وہ سیرت اور وہ اخلاقی بلندی بھی موجود ہوتی جو مجتہد کے لیے ایک شرط ضروری ہے تو مسلمان ان کے اجتہادات پر ضرور اعتماد کرتے لیکن لوگوں نے ان کی دین فروشی اور دنیا سازی کے تماشے دیکھ دیکھ کر سلامتی اسی میں پائی کہ ان دنیا پرستوں کے اجتہادات کے بجائے ان اگلوں کی تقلید ہی پر قناعت کریں جن کے علم کی طرح ان کی سیرت بھی سرکسوٹی پر کھری ثابت ہوچکی تھی۔ اسی پہلو سے شرائط اجتہاد کے سلسلہ میں سیرت کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آدمی کا اخلاق قابل اعتماد نہ ہو تو اس پر دنیا کے بھی کسی اہم معاملہ میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ اس پر ایک ایسے معاملہ میں اعتماد کیا جائے جس کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ آج بھی غور کیجیے تو درحقیقت ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ لوگ اجتہاد کو کوئی کفر اور تقلید کو کوئی جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ

ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اصل چیز یہی ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ اجتہاد کے مدعی بن کر کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کی نگاہوں میں نہ ان کے علم کا کوئی وزن قائم ہوتا ہے نہ ان کے تقویٰ کا۔ لوگ مجتہد کے اندر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی سیرتوں کے پرتو ڈھونڈتے ہیں اور امام ابن تیمیہؒ کی عزیمت اور شاہ ولی اللہؒ کا تقدس تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش میں لوگ حق بجانب بھی ہیں۔ آخر وہ ان لوگوں کے اجتہادات پر کس طرح اعتماد کریں جن کو وہ دنیا کی خاطر ہر چیز کو فروخت کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

تقلید کو ختم کرنے کے طریقے

اب اگر تقلید کو ختم کرکے اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہے تو یہ کام محض تقلید کی مذمت کرنے اور اجتہاد کی منقبت بیان کرنے سے نہیں ہوگا بلکہ ان اسباب کا موثر طریقوں سے ازالہ کرنا ہوگا جو اجتہاد کی اس بندش اور تقلید کے اس عالمگیر فروغ کے سبب بنے ہیں۔ میرے نزدیک اس مقصد کے لیے جن باتوں کا اختیار کیا جانا ضروری ہے، ان میں سے چند کا میں ذکر کروں گا۔

اس کے لیے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم بالکل بدلے۔ قدیم وجدید درسگاہوں کی تقسیم کو ختم کرکے ایک ہی جامع نظام تعلیم جاری کیا جائے اور اس نظام کی بنیاد عربی زبان اور قرآن و حدیث کی تعلیم پر ہو۔ موجودہ نظام میں جو اہمیت آج انگریزی تعلیم کو حاصل ہے وہ اہمیت عربی کو دی جائے اور انگریزی کو ایک ثانوی حیثیت دی جائے۔ جدید علوم و فنون کی اہمیت کم نہ کی جائے لیکن قرآن و حدیث اور فقہ کو وہ اہمیت دی جائے جس کے وہ فی الواقع مستحق ہیں تاکہ طلبہ قرآن و حدیث کو براہ راست سمجھ سکیں اور پورے اعتماد کے ساتھ ان کی قانونی مشکلات میں کوئی رائے قائم کرسکیں۔ ہمارے لا کالجوں اور ہماری یونیورسٹیوں میں پورا اسلامی قانون اس کے فلسفہ کے ساتھ پڑھایا جائے اور طلبہ کے ذہنوں میں یہ بات جاگزیں کی جائے کہ موجودہ دور ایک عبوری دور ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اسی قانون اور اسی فلسفہ قانون کو اس ملک میں موجودہ قانون اور موجودہ فلسفہ قانون کی جگہ لینی ہے۔ اسلامیات کا نصاب بہت جامع اور مکمل ہونا چاہیے اور اس کی تعلیم دینے والے بھی وہ لوگ ہونے چاہئیں جو اپنے فنون میں کمال رکھنے والے ہوں۔ لا کالجوں میں اسلامی قانون کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ طلبہ اسلامی فقہ کی مختلف شاخوں میں بھی موازنہ اور مقابلہ کرسکیں اور اسلامی قانون کا دوسرے قوانین سے بھی مقابلہ کرسکیں اور ان کی رہنمائی ایسے اساتذہ کریں جو دوسرے قوانین پر اسلامی قانون کی برتری

کے قابل ہوں اور اعتماد کے ساتھ اس کی ترجیح دوسرے قوانین پر ثابت کر سکیں۔

یہ طے کرنا تعلیمی ماہروں کا کام ہے کہ موجودہ عبوری دور میں ان مختلف اور متنوع تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جائے لیکن اگر ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے جو اسلامی قانون میں اجتہاد کا درجہ حاصل کر سکیں تو اس کے لیے پہلا قدم یہی ہے کہ نظام تعلیم میں مطلوبہ تبدیلی پیدا کی جائے۔ ہمارے لا کالجوں میں اب تک جو تبدیلی ہوئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ نصاب میں اسلامی اصول فقہ بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن نہ تو اس مقصد کے لیے موزوں کتابیں دستیاب ہیں نہ ایسے اساتذہ ان کالجوں میں موجود ہیں جو اپنی قابلیت سے کتابوں کی کمی پوری کر سکیں۔ کام تو مبارک شروع ہوا ہے لیکن یہ جس نیم دلی اور بے دردی کے ساتھ شروع ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے جی ڈرتا ہے کہ کہیں یہ مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر نہ ثابت ہو۔

دوسری چیز جو اس سلسلہ میں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ماحول بدلے۔ ان کے اندر اسلامی قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی ماحول ہونا بھی ضروری ہے۔ اسلامی قانون کوئی منفرد اور تنہا چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع فکری، اعتقادی، نظریاتی اور اخلاقی نظام کا ایک جزو ہے اور اس کے تمام اجزا باہم دگر مربوط ہو کر ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس کو صرف کسی نہ کسی طرح پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس عقیدہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے جس عقیدہ کی اساس پر یہ قائم ہے۔ اس کی صرف ڈگری حاصل کر لینا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس ڈگری کے ساتھ ڈگری حاصل کرنے والے میں اس ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا بھی ضروری ہے جس کے بغیر اس کا حق ادا ہونا ناممکن ہے۔ رومن یا انگریزی قانون کا ایک ماہر جج اور اسلامی قانون کا ایک ماہر قاضی دونوں اپنے اپنے دائروں میں کام تو ایک ہی طرح کے کرتے ہیں لیکن دونوں کی ذمہ داریوں کی نوعیت میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایک صرف اپنے قانون کے الفاظ کے آگے جواب دہ ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنے ضمیر کے سامنے۔ برعکس اس کے دوسرے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کی توضیح یا تنفید کرتا ہے اور اس کی اصل جواب دہی کل کو خدا کے آگے ہے۔ ایک جج اگر قانونی موشگافیوں میں مہارت رکھتا ہے تو وہ بہت بڑا جج ہے لیکن کوئی قاضی ایک معیاری قاضی نہیں ہو سکتا جب تک وہ اسلامی قانون کی اصل روحانیت کا حامل نہ ہو اور قانون کے لفظوں کے معانی سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہ احکم الحاکمین سے ڈرنے والا بھی نہ ہو جس نے

یہ قانون نازل فرمایا ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس طرح کے جج اور وکیل پیدا کرنے کے لیے ہماری موجودہ یونیورسٹیوں اور موجودہ کالجوں کا ماحول نہایت ناسازگار ہے۔ ان کے اندر اس سیرت و اخلاق اور اس ذہن و مزاج کی تخلیق اور پرورش ناممکن ہے جو منصب افتا و اجتہاد اور فریضہ قضا کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے ضروری ہے۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ پچھلوں کے اجتہاد کے مقابل میں اگلوں کی تقلید کو ترجیح دینے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب لوگوں کے نزدیک یہ بھی رہا ہے کہ لوگ کمزور سیرت کے مدعیان اجتہاد پر اعتماد کرنے میں اپنی آخرت کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے۔

تیسری ایک اور چیز بھی اس سلسلہ میں ضروری ہے جس کا تعلق جدید و قدیم دونوں ہی طبقات سے ہے وہ یہ کہ اسلامی قانون کا مطالعہ فرقہ وارانہ تعصب کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ ہر قسم کے گروہی تعصبات سے آزاد ہو کر کیا جائے۔ فقہ خواہ امام مالکؒ کی ہو، یا امام ابو حنیفہؒ کی، امام شافعیؒ کی ہو یا امام احمد بن حنبلؒ کی، یہ سب اسلامی ہی فقہ ہے۔ ان سب کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ ان کے اصول استنباط و اجتہاد ایک سے ہیں۔ یہ سب فقہیں ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ ان میں سے جس فقہ کے کسی اجتہاد کو بھی ہم اس کے دلائل کی روشنی میں جانچ کر اختیار کر لیں گے انشاءاللہ ہم حق ہی پر ہوں گے، حق سے انحراف کا اندیشہ کسی میں بھی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ضروری باتیں اور بھی ہیں جن کو میں اپنے کسی اور لکچر میں بیان کروں گا۔

اجتہادی رائے کی شرعی حیثیت

اجتہاد خواہ کسی بڑے مجتہد کا ہو یا کسی چھوٹے مجتہد کا، اس کی حیثیت ایک رائے سے زیادہ نہیں ہے۔ حضرت معاذؓ والی حدیث کا حوالہ میں اوپر دے چکا ہوں، انھوں نے اپنے اجتہاد کو رائے ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ رائے کتاب و سنت کے اشارات اور نظائر و قیاسات پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا قائم کرنے والا کتاب و سنت کا ایک ماہر اور دین کا ایک رمز شناس ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا درجہ اس رائے سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں ایک عام آدمی مجرد عقل و فہم کی مدد سے قائم کرتا ہے۔ اس کے رائے ہونے میں تو کلام نہیں ہے لیکن یہ اس مفہوم میں رائے نہیں ہے جس مفہوم میں یہ لفظ ہم اپنی عام بول چال میں بولتے ہیں۔ اس کے رائے ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی حیثیت نص کی نہیں ہے۔ اس میں صحت کے ساتھ غلطی کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اس وجہ سے

اس کا رد و قبول اس کے دلائل پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک اجتہاد کے دلائل سے مطمئن ہے تو اس کے لیے وہ اجتہاد حجت ہے۔ پھر اس کے لیے اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس کی بنا پر دوسروں سے لڑنا جھگڑنا یا ان کی تکفیر و تفسیق کرنا درست نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ ائمہ اپنے اجتہاد کے خلاف کبھی کبھی دوسروں کے اجتہاد پر بھی عمل کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اجتماعی و سیاسی معاملات میں تو صحیح روش یہی ہے کہ نظام جس اجتہاد پر چلے آدمی عملاً اس کی اطاعت کرے اگرچہ اس کا اپنا اجتہاد اس سے مختلف ہو۔

اجماع اجتہادی مسائل میں سے صرف وہی مسئلہ رائے کے درجہ سے بالاتر ہو جاتا ہے جس پر مجتہدین امت کا اجماع ہو جائے۔ اجماع اجتہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ کسی اجتہاد پر اجماع ہو جانے کے بعد اس کی حیثیت صرف ایک رائے کی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ شریعت کے نصوص کی طرح ایک حجت شرعی بن جاتا ہے جس کی مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

اجماع کے متعلق چند باتیں معلوم کر لینی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ اجماع کا تعلق چونکہ اجتہاد سے ہے اس وجہ سے شریعت میں معتبر صرف وہی اجماع ہے جو مجتہدین امت کا اجماع ہو۔ اس میں اصلی اہمیت صرف اتفاق رائے کی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے اتفاق رائے کی ہے جو اجتہاد کا منصب رکھتے ہوں۔ عوام کے اس اتفاق رائے کی تو شریعت میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے جس سے مجتہدین الگ ہوں یا جس میں ان کی رائے ملحوظ نہ رکھی گئی ہو۔

دوسری یہ کہ اجماع کسی شرعی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یعنی سوال یہ ہو کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا حکم کیا ہے، پھر کوئی حکم شرعی معین ہو اور اس پر اصحاب اجتہاد متفق ہو جائیں۔ مجرد یہ بات کہ مسلمان قوم کسی چیز پر متفق ہو گئی ہے قطع نظر اس بحث سے کہ اس بارہ میں شریعت کا حکم کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے، یہ وہ اجماع نہیں ہے جس کو شریعت میں ایک حجت شرعی کی حیثیت حاصل ہے۔

اجماع سے متعلق جو یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ ایک دور کے تمام مجتہدین، ایک وقت میں ایک ہی طرح کے الفاظ میں کسی اجتہاد پر اتفاق کریں تو یہ اجماع ہے۔ یہ محض تکلف ہے جب کسی چیز کی فنی تعریف کی جائے گی تو اس طرح کے التزام مالا یلزم محض تعریف کی منطقیت کی وجہ سے

بسا اوقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس طرح کی چیزوں کو دین کے اصولوں کا مذاق اڑانے کا بہانہ بنائے تو وہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھے گا۔ اجماع کی فنی تعریف جو کچھ بھی ہو لیکن اصل مقصود صرف یہ ہے کہ جس امر اجتہادی پر مجتہدین وقت متفق ہوں اور اس کے خلاف کوئی موثر اور قابل ذکر اختلاف معلوم نہ ہو، اس کے متعلق یہ تسلیم کیا جائے گا کہ اس پر اجماع ہے۔ محض اس مفروضہ پر کہ ممکن ہے اس دور کے کسی مجتہد کو اس سے اختلاف رہا ہو اور وہ ہمارے علم میں نہ آیا ہو اس کے اجماع ہونے سے انکار کر دینا کوئی معقول بات نہیں معلوم ہوتی۔ زندگی کے کاروبار اس طرح کے مفروضات پر نہیں چلا کرتے۔ نہ تو کسی دور کے اہل اجتہاد ہی مخفی رہتے ہیں اور نہ وہ مسائل ہی مخفی رہتے ہیں جن کے بارہ میں لوگوں کو یہ جستجو ہو کہ ان پر اجماع ہوا ہے یا ان کے بارہ میں اختلاف ہے۔

ہمارے جو ائمہ اجماع کو حجت ماننے کے باوجود اس کے وقوع کو نہیں مانتے وہ اجماع کے خلاف نہیں ہیں بلکہ درحقیقت ان فقہاء کے خلاف ہیں جو اپنے کسی اختیار کردہ مسلک و مذہب کی حمایت کے جوش میں بات بات پر اجماع کا دعویٰ کر بیٹھتے تھے۔ عام قاعدہ ہے کہ آدمی جس بات کو خود مان لیتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ساری دنیا اسی کو مانے۔ بسا اوقات وہ اپنی اسی خواہش کو واقعہ فرض کر لیتا ہے اور دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ اسی مسلک کے سب ہمنوا ہیں۔ ہماری فقہ کی کتابوں میں اس طرح کے غالیانہ دعاوی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ اجماع کے یہ دعوے عموماً ایسے مسائل سے متعلق ہیں جن کی دین میں کوئی خاص اہمیت نہیں محسوس ہوتی۔ ظاہر ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اجماع کا دعویٰ تسلیم کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ آخر اس قسم کے اجماعات کی تحقیق کس طرح ہو؟ معاملہ اگر غیر معمولی اہمیت کا حامل نہیں ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ جس چیز کے بارہ میں ایک شخص اجماع کا مدعی ہے دوسرے اہل فکر نے اس کو اس نگاہ سے سرے سے دیکھا ہی نہ ہو۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں تو یہ بات تھی کہ جب کوئی اہم اجتہادی مسئلہ پیش آتا تو امیر المومنین وقت کے اکابر اہل علم و اجتہاد کو بلاتا، ان سے مشورہ کرتا، پھر مشورہ اور غور و بحث کے بعد جو بات طے پا جاتی وہ اجماعی بات سمجھی جاتی۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے وقت میں تو تقریباً تمام بڑے بڑے مجتہد صحابہ مرکز خلافت یعنی مدینہ ہی میں موجود بھی رہتے تھے۔ جو لوگ باہر ہوتے تھے مدینہ کے اکابر کے اتفاق رائے کے بعد نہ تو وہ خود اپنی راؤں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور نہ

دوسروں ہی کو کسی کی رائے کا انتظار رہ جاتا تھا اس وجہ سے اس مبارک دور کے متعلق تو وضح طور پر معلوم ہے کہ فلاں بات پر اجماع ہوگیا۔ لیکن بعد کے زمانوں میں جب کہ انتشار کی وجہ سے یہ صورت حال قائم نہ رہ سکی یا حکمرانوں نے اجتہادی امور میں اصحاب اجتہاد کی رائیں معلوم کرنا اور غور و بحث کے بعد کسی بات کو طے کرنا چھوڑ دیا، کسی بات پر اجماع کا معلوم کرنا مشکل ہوگیا۔ اس وجہ سے بعض ائمہ بعد کے زمانوں میں کسی اجماع کے انعقاد کو نہیں مانتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعد کے زمانوں سے متعلق کسی بات پر باضابطہ اجماع منعقد ہونے کا دعویٰ کرنا فی الواقع مشکل ہے۔ لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود یہ سوال ایک قابل غور سوال ہے کہ بعد کے زمانوں میں اگر کسی امر پر تمام معروف اہل اجتہاد متفق ہیں اور کسی قابل ذکر صاحب اجتہاد کا اختلاف اس کے بارہ میں منقول نہیں ہے تو کیا اس کے اجماع ہونے سے محض اس مفروضہ کی بنا پر انکار کیا جائے گا کہ ممکن ہے کچھ اصحاب اجتہاد کو اس اجماع کی اطلاع نہ ہوسکی ہو اس وجہ سے انھوں نے اپنی رائیں اس کے بارہ میں نہ ظاہر کی ہوں یا ظاہر کی ہوں لیکن ان کا اختلاف رائے ہم کو نہ پہنچ سکا ہو۔

اسی طرح ائمہ اربعہ اگر کسی بات پر متفق ہیں تو اس کی حیثیت بھی محض ایک رائے کی نہیں رہ جاتی۔ اگرچہ ہم اس کو اصطلاحی اجماع کا درجہ نہ دے سکیں اور اس سے اختلاف کرنے کو ناجائز نہ ٹھہرائیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ہر دور کے اہل علم بیشتر انہی ائمہ سے وابستہ رہے ہیں۔ ان سے الگ مسلک اختیار کرنے کی کوشش اول تو کسی نے کی ہی نہیں اور اگر کی بھی تو اہل علم میں وہ مسلک اعتماد حاصل نہ کرسکا۔ اس وجہ سے اگر ائمہ اربعہ کسی اجتہاد پر متفق ہیں تو اس کو صرف انہی کی رائے کی حیثیت سے نہیں لینا چاہیے بلکہ اس کو ان کے زمانوں کے تمام قابل اعتماد لوگوں کی رائے سمجھنا چاہیے۔

موجودہ زمانہ کا اجماع | یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر کسی خاص خطہ میں کوئی صحیح قسم کی اسلامی حکومت قائم ہو اور اس کے مجتہدین کسی امر اجتہادی پر اجماع کرلیں تو یہ اجماع حجت ہوگا یا نہیں؟ میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اجماع اس حکومت کے مسلمانوں کے لیے تو حجت ہوگا لیکن دوسروں کے لیے یہ حجت نہ ہوگا اس لیے کہ اس اجماع کی حیثیت اجماع امت کی نہیں ہے۔ اور اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ اس اجماع کے خلاف بھی اجماع ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں

خدا خدا کرکے وہ صبح سعادت طلوع ہوئی جس کی دوپہر سے پہلے ہمیں عرفات جانے کے لیے منیٰ پہنچنا تھا۔ اس صبح کا آنا بھی قیامت تھا اور نہ آنا بھی قیامت تھا۔ اس کے لیے انتظار اس شدت کا کہ شاید کہ مدت العمر اس طرح کا انتظار کسی چیز کے لیے ہوا ہو اور پھر جب آگئی تو اس کی آمد پر اضطراب ایسا کہ اس طرح کے اضطراب کا تجربہ بھی زندگی میں کم ہی ہوا ہوگا۔ روانگی کے پروگرام کی ساری تفصیلات پہلے علم میں تھیں اور اب تک کے تجربات کی روشنی میں معلم صاحب کے بیان پر بے اعتمادی کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں تھی لیکن اس صبح سعید کو لانے والی رات مجھ پر بڑی ہی سخت گذری۔ بظاہر تو میں نے معمول کے مطابق عشا کی نماز کے بعد تکیہ پر سر رکھ دیا لیکن سویا شاید ایک منٹ بھی نہیں۔ بس عرفات اور منیٰ کا خیال دل و دماغ پر مسلط اور میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ چند گھنٹوں کی رات معلوم ہو کہ پہاڑ بن گئی ہے۔ صرف ایک ہی دعا زبان اور دل دونوں پر جاری رہی کہ پروردگار سلامتی کے ساتھ عرفات میں پہنچا دے۔

ساری رات شہر میں جو گہما گہمی رہی اس کا اندازہ وہ لوگ کسی طرح نہیں کرسکتے جنھوں نے ملہائے حج کی یہ رات دیکھی نہ ہو۔ گہما گہمی تو ہفتوں پہلے سے تھی لیکن آج کی رات تو بس کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہو کہ مکہ کی سرزمین دہل رہی ہے۔ موٹروں، بسوں اور ٹرکوں کی وہ کثرت کہ اس کثرت کا کوئی اندازہ تو کیا میرے ذہن میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اول تو یہاں موٹریں اور بسیں ہی بہت زیادہ لیکن خاص کر حج کے دنوں میں تو سارے ملک کی موٹریں اور بسیں یہیں جمع ہوجاتی ہیں۔ میں نے اپنے مکان کے چھجے سے ایک آدھ مرتبہ باہر کا نظارہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے نظر آیا کہ مکہ کی ہر چیز آج حرکت میں ہے۔ ہزاروں موٹروں اور ٹرکوں کے ساتھ ہزاروں پیادہ پا اور ہزاروں اونٹ اور گدھے اور خچر بھی

گذرتے ہوئے نظر آتے۔ مجھے اس رستخیز کو دیکھ کر بار بار اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ آخر اس ہنگامۂ قیامت کے اندر ہزاروں حادثے کیوں نہیں ہوجاتے لیکن یہ واقعہ ہے اور میں اس واقعہ کا اعتراف کروں گا کہ نہ میں نے کسی حادثہ کی اطلاع سنی اور نہ کوئی حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

منیٰ کی روانگی کی صبح کو فجر کی نماز سے فارغ ہو کر جب میں حرم سے نکلا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیدل جانے والے قافلے اپنے اپنے معلموں کے آدمیوں کی رہنمائی میں منیٰ کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔ ہر قافلے کے ساتھ اس کے معلم کا مخصوص جھنڈا ہوتا تاکہ ہجوم کی ریل پیل میں قافلہ کا کوئی آدمی بچھڑ جائے تو وہ جھنڈے کو دیکھ کر قافلہ کے ساتھ شامل ہوسکے۔ یہ پیدل چلنے والے لوگ زیادہ تر خرچ کی کفایت کے خیال سے ایسا کرتے ہیں، ورنہ ہے یہ مشقت بہت ہی سخت۔ مشقت کی سختی کے باوجود جب میں نے ان جانبازوں کو دیکھا کہ احرام کی چادریں لپیٹے ہوئے، پانی کے مشکیزے لٹکائے ہوئے اور تلبیہ پڑھتے ہوئے دیوانہ وار منیٰ کے لیے چل کھڑے ہوئے ہیں تو مجھے اپنی کم ہمتی پر شرم آنے لگی اور دل چاہتا کہ ہم بھی انہی کے ساتھ چل کھڑے ہوں۔

میں نے ان مناظر کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ حکومت حجاز کو ہر سال جس صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے، دنیا کی کسی حکومت کو بھی اس صورت حال سے سابقہ نہیں پیش آتا۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق ملکی اور غیر ملکی دونوں قسم کے حاجیوں کی کل تعداد اس سال غالباً نو لاکھ تھی[1]۔ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو اوقات کی پوری پابندی کے ساتھ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ اور پھر مکہ معظمہ پہنچانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ پھر ان حجاج کی بہت بڑی اکثریت، بوڑھوں، مریضوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ملک کی زبان سے بے خبری مزید براں۔ سفر کے تجربات کے لحاظ سے اگر ان لوگوں کے حالات کا اندازہ کرنا ہو تو اس چھوٹے سے واقعہ سے کیجیے کہ واپسی کے وقت عین جہاز پر سوار ہوتے وقت جہاز کی سیڑھیوں کے سامنے معلوم ہوا کہ ایک صاحب کا پاسپورٹ گم ہے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کہاں رکھا تھا تو انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ میں نے اس کو پکڑا دیا تھا اس نے سالن پکانے والی دیگچی میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح کے حوادث ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پیش آتے ہیں جن سے ملک کی حکومت کو بھی اور باہر کے سفرا کو بھی عہدہ برا ہونا پڑتا ہے۔

[1] یہ ذکر پچھلے سال کا ہے۔

منیٰ اور عرفات بھیجنے اور وہاں سے حجاج کو واپس لانے کے اس عام انتظام کے علاوہ جو معلمین کی نگرانی میں انجام پاتا ہے مجھے معلوم ہوا کہ حکومت کا ایک خاص انتظام بھی ہے وہ یہ کہ سعودی حکومت حجاج کو منیٰ وعرفات بھیجنے اور ان کو وہاں سے واپس لانے کی آخری ذمہ داری خود اپنے اوپر سمجھتی ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے جو طریقہ وہ اختیار کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جب عام حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوچکے ہیں تو بالکل آخر وقت میں سرکاری ٹرک پولیس کے آدمیوں کے ساتھ سارے شہر میں گشت کرتے ہیں اور وہ منیٰ جانے والے ہر زندہ وجود کو بہرحال وقت پر منیٰ پہنچا دیتے ہیں۔ یہی صورت حکومت منیٰ، عرفات، مزدلفہ ہر جگہ اختیار کرتی ہے۔ اگر کوئی حاجی گم ہو تو معلم کا فرض ہے کہ وہ حکومت کو مطلع کردے، حکومت اس کو معلم کے پاس پہنچا دے گی اور اگر کوئی حاجی معلم کا نام نہ بتا سکے تو حکومت ہر جگہ اس کے قیام و طعام کی ذمہ داری خود اٹھاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حکومت کا یہ انتظام اتنا اچھا ہے کہ کتنے لوگ منیٰ اور عرفات میں اس انتظام سے متمتع ہونے کے لیے قصداً "گم شدہ" بن جاتے ہیں۔

منیٰ کے لیے روانگی روانگی سے کچھ پہلے معلم صاحب نے ہمارا ضروری سامان جو منیٰ اور عرفات کے لیے ہمیں ساتھ لینا تھا اپنے مکان پر منگوالیا اور ہمیں ہدایت کی ہم فلاں وقت ان کے مکان پر پہنچ جائیں روانگی وہیں سے ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ مکان کے اندر پانی کا جو مٹکا ہے وہ ضرور بھروا لیا جائے، واپسی کے بعد کئی دن تک پانی کا سارا نظم درہم برہم رہے گا، پانی موجود نہ ہوا تو سخت پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ معلم صاحب کی اس ہدایت نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ وقت ایسا تھا کہ ہر شخص پر نفسی نفسی کی حالت طاری تھی۔ کوئی شخص کسی کی بات اول تو سننے ہی کے لیے تیار نہیں تھا اور اگر کسی طرح سن لیتا تھا تو اس کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ کسی مزدور کو بلائیے کہ کسی گٹھری کے اٹھانے میں ذرا آپ کی مدد کردے تو وہ پانچ ریال دس ریال کا مطالبہ پیش کرتا۔ سقے اول تو بات ہی نہیں سنتے تھے اور اگر سنتے تھے تو پانی کو شربت روح افزا کے بھاؤ بیچتے تھے۔ پھر ہمارے مکان کا مٹکا بھی کوئی معمولی مٹکا نہیں تھا۔ ماشاءاللہ پورا قدم آدم۔ میں نے مکان کی چوتھی منزل سے گلی میں گذرنے والے ایک دو سقوں کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن میری کمزور